محمد حنیف ندوی

قرآن میں رمز و اشارہ کی چند مثالیں

کیا قرآنِ حکیم میں رمز و اشارہ کی رعایتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور کیا اس حقیقت کو تسلیم کر لینے سے کہ اس میں بعض نازک اور پیچیدہ مطالب کو مجاز و تمثیل کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے علم و معرفت کے اہم مسائل پر روشنی پڑتی ہے؟

یہ ہے وہ سوال جس کو ہم آج کی اس صحبت فکر و دانش میں موضوع بحث ٹھہرانا چاہتے ہیں نامناسب نہ ہوگا اگر اس مرحلہ میں سٹیس (STACE) کا یہ دو ٹوک فیصلہ نقل کر دیں کہ زبانوں کی اصل وضع مادیت کی اساس پر ہوتی ہے اس لئے جب بھی ان مطالب و معانی کا اظہار کرنا ہوگا جو ذہنی و فکری خصوصیات کے حامل ہیں تو لامحالہ ہمیں استعارہ و تشبیہہ سے کام لینا پڑیگا اور گھوم پھر کر اسی ذخیرہ الفاظ کو استعمال کرنا ہوگا جو اپنی وضع و نہاد کے اعتبار سے سراسر مادی ہے۔ گویا

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سٹیس نے اس سلسلہ میں چند مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ مثلاً ہم جب کسی شخص کی ذہنی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں یہ صاف ذہن کا آدمی ہے اور اس کے انداز فکر میں کہیں بھی الجھاؤ یا التباس پایا نہیں جاتا۔ ظاہر ہے صفائی یا الجھاؤ دونوں کیفیتیں مادی ہیں اور معانی پر ان کی دلالت ثانوی درجہ کی ہے اسی طرح جب ہم کہتے ہیں فلاں شخص روشن ضمیر ہے یا فلاں شخص کے خیالات و افکار میں روشنی اور تنفدی کی

یہ مقالہ فلسفہ کانگریس کے سالانہ اجلاس بتاریخ ۵ رجنوری سنہ ۱۹۶۲ منعقدہ راجشاہی میں پڑھا گیا تھا۔

جھلک نمایاں ہے تو یہاں بھی ہم تنوّر اور روشنی کو جو مادی کیفیتیں ہیں ایسے معانی کے اظہار کا ذریعہ ٹھہراتے ہیں جو مادی نہیں۔ [1]

سیٹس اس سے مختلف سیاق میں دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رموز (SYMBLOLS) کا استعمال لسانیات کا ایک ضروری جزو ہے جس سے کوئی بھی ترقی یافتہ زبان بے نیاز نہیں رہ سکتی رہا یہ سوال کہ اسکی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ہر زبان اپنی وضع و ساخت کے اعتبار سے ایسے ہی ذخیرۂ الفاظ پر مشتمل ہے جس کی دلالتیں صرف اقلیم محسوسات ہی تک محدود ہیں، معانی، کلیات اور لطائف فکر کا ادراک اس کے بس کا روگ نہیں!

بالخصوص زبانیں جب ارتقاء کے اس مرحلہ میں پہنچتی ہیں۔ جہاں مذہب کے عقائد و تصورات کو سلجھانا پڑتا ہے اور حکمت و فلسفہ کی عشوہ طرازیوں کا براہ راست سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس وقت ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ رموز و مجازات سے تعرض کریں اور مادی الوضع الفاظ، اور مادی سرشت پیرایہ بیان سے اظہار معانی کا کام لیں۔ چنانچہ اپنشدوں کے دانشور مرتبین کو جب واضح کرنا پڑا کہ اس عالم ہست و بود کی نیرنگیاں کیونکر بسیط حقیقت کے فیضان کا نتیجہ ہیں یا اس کائنات رنگا رنگ کو کس طرح وحدت محضہ کا برگ و ثمر قرار دیا جا سکتا ہے تو انہیں کچھ اس نوع کا انداز بیان اختیار کرنا پڑا۔ جیسے ایک آگ رنگ و شرر کی بوقلمونیوں کا باعث ہوتی ہے یا جیسے ایک عنکبوت کے بطن سے تار و پود کا ایک غیر مختتم سلسلہ ظہور پذیر ہوتا چلا جاتا ہے۔"

رمز و استعارہ کی جھلک زیادہ وضاحت سے دیکھنا ہو تو بائبل کے اوراق الٹ کر دیکھئے۔ یہاں قدم قدم پر آپکو الہیات کے باریک نکات جسمانیات کی دبیز اصلاحوں میں لپٹے ہوئے ملیں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی اس سطوت و اقتدار کیلئے جو سراسر قانون و عقل کی ہمہ گیریوں سے تعبیر ہے کہا جائے گا۔ کہ وہ دنیا کے بادشاہوں کی طرح تخت نشین ہے۔ [2] اس کے علم کو جو بندوں کے اعمال سے وابستہ ہے اس طرح کے الفاظ میں ظاہر کیا جائے گا۔ "کہ اس کی آنکھیں بنی آدم کو دیکھتیں اور اس کی پلکیں اس کو جانتی ہیں" [3] یہی نہیں۔ یہاں

---

[1] دیکھیے اے کریٹیکل ہسٹری آف گریک فلاسفی ص ۱۰، ۱۱، ۱۲، یہاں یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ زبان کی تحقیق کے بارہ میں علم اللسان کے ماہرین کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ گروہ ہے جو زبانوں کو الہامی مانتا ہے اس صورت میں انکی وضع مادی نہیں رہتی دوسرا گروہ یہ سمجھتا ہے۔ کہ زبانیں مختلف قوموں اور ذہنوں کے مخصوص ارتقاء کا نتیجہ ہیں اس گروہ کی رائے نسبتاً زیادہ صائب و صحیح ہے اور ہم اسی کے قائل ہیں۔

[2] زبور ۸-۷۔ [3] زبور ص ۱۱؟ -

یہاں سے بجھنے والوں کیلئے اس کے چہرے کی ضیاء افروزیاں بھی ہیں[۱] اور منہ اور لب کی گل افشانیاں بھی۔ وہ اس حد تک خفگی اور غضب کا اظہار کرتا ہے کہ اس کے نتھنوں سے دھواں اٹھنے لگتا ہے اور اس کے منہ سے شعلے نکلنا شروع ہو جاتے ہیں[۲]۔

زیادہ واضح اور زیادہ نکھرے ہوئے حسین تغزل کے نمونوں میں عشق و محبت کے واردات اور حکمت و معنی کی دلفریبیاں دیکھتا ہوں تو سلیمان کی غزل الغزلات میں دیکھئے بعض محققین نے بلاشبہ اسے وضعی والحاقی قرار دیا ہے اور حضرت سلیمان کی طرف اس کے انتساب کو صحیح نہیں جانا مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ دیکھنا تو یہ ہے کہ قدیم سے مذہبی و دینی بصیرت نے اونچے اور لطیف حقائق کو ہمیشہ تمثیل و مجاز ہی کے پردوں میں جلوہ گر دیکھا ہے اور یہ مقصد بہر حال ان مرموزات سے بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے۔

کیا عربی زبان کا دامن بھی مجاز و تمثیل کی رنگینیوں سے آراستہ ہے؟ اور کیا قرآن حکیم نے بھی کہیں کہیں واضح اسلوب بیان سے ہٹ کر رمز و اشارہ کی زبان میں گفتگو کی ہے؟ آیئے زیادہ پھیلاؤ کو دعوت دیئے بغیر ان دونوں پہلوؤں پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں۔

جن لوگوں نے علوم بلاغت سے مناسبت پیدا کرنے کی تھوڑی سی کوشش کی ہے وہ جانتے ہیں کہ عربی ادبیات کا ذخیرۂ شعر و نثر دنیا کی دوسری اہم زبانوں کی طرح کس حد تک اس نوع کے لطائف سے مالا مال ہے۔ خالص فنی نقطہ نظر سے مجاز و استعارہ کے متعلقات پر سیر حاصل بحث سے لطف اندوز ہونا ہو تو امیر المومنین یحیٰی یمنی کی کتاب "الطراز" دیکھنا چاہیئے۔ اس نے پہلی ہی جلد میں اس مسئلہ پہ حسن و قت نظر وسعت مطالعہ اور منطقی تجزیہ سے کام لیا ہے یہ صرف اسی کا حصہ ہے حتیٰ کہ اس باب میں صاحب دلائل الاعجاز بھی نسبتاً پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔

اسنے بتایا ہے کہ مجاز کے بارہ میں اہل شناسان کلام میں دو مدرسہ ہائے فکر پائے جاتے ہیں ایک گروہ جو ابن جنی کی طرح یہ کہتا ہے کہ لغت کا اکثر و بیشتر حصہ مجازات ہی پر مشتمل ہے حتیٰ کہ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے۔ رایت زیدا۔ میں نے زید کو دیکھا تو روزمرہ کا یہ استعمال بھی مبنی بر حقیقت نہیں ہوتا کیونکہ اس نے

---

[۱] زبور ۱۳-۱۱۰ھ [۲] زبور ۱۸-۸ و ۹

جو کچھ دیکھا ہے وہ مکمل زید نہیں بلکہ زید کا بعض حصّہ ہے ابن جنی کا مقصد یہ ہے کہ جب اس طرح کے غیر ادبی جملوں میں بھی ہم تجوز سے دامن کشاں نہیں رہ سکتے تو ادبی استعمالات میں فکر و تخیل کی وسعتوں اور لطافتوں کو کیونکر الفاظ کے حقیقی اور سادہ استعمال تک محدود رکھنا ممکن ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو سرے سے مجاز کے وجود ہی کے قائل نہیں۔ اس کا موقف یہ ہے کہ الفاظ کا ہر استعمال حقیقی ہے معروف اور متعین ہے لہذا یہ سوال ہی نہیں ابھرتا کہ خواہ مخواہ، مجاز و استعارہ کی ضرورتوں کو تسلیم کیا جائے۔

علامہ یمنی کا کہنا ہے کہ یہ دونوں گروہ افراط و تفریط کا شکار ہیں کیونکہ نہ تو یہ بات قرین عقل ہے کہ کلام سراسر مجاز ہی کا رہین منت ہو اور نہ یہ عقیدہ درست ہے کہ اس میں مجاز و استعارہ کی چاشنی پائی ہی نہیں جاتی۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

اعلم ان فی الناس من زعم ان اللغۃ حقیقۃ کلہا۔ وانکر المجاز وزعم انہ غیر وارد فی القرآن ولا فی الاحکام، ومنہم من زعم ان اللغۃ کلہا مجاز ان الحقیقۃ غیر محققۃ فیہا۔ ھذان المذھبان لا یخلوان عن فساد فانکار الحقیقۃ فی اللغۃ افراط و انکار المجاز تفریط۔[1]

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کچھ لوگ وہ ہیں جو لغت کو تمام تر حقیقت پر محمول کرتے ہیں۔ اور مجاز کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن و احکام میں کہیں بھی مجازات کا استعمال نہیں ہوا۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے خیال میں لغت و کلام تمام تر مجازات پر مشتمل ہے اور کہیں بھی حقیقی استعمال پایا نہیں جاتا۔ یہ دونوں باتیں فکر و نظر کے فساد پر مبنی ہیں۔ کیونکہ حقیقت کا انکار سراسر افراط ہے اور مجاز کی تردید تفریط۔

جہاں تک سوال کے دوسرے پہلو کا تعلق ہے مندرجہ ذیل چند حقائق ذہن میں التسام پذیر رہنا چاہئیں۔

(۱) قرآن حکیم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس میں وہ تمام خصوصیات، وہ تمام رعایتیں

---

[1] الطراز ج ۱ صفحہ ۴۴ مطبع المقتطف مصر۔

اور مناسبتیں ہونی چاہئیں جو ایک زبان میں ہو سکتی ہیں، جو عربیت کا طرۂ امتیاز ہیں یا جن کو ایک مقدس اور الہامی کتاب کے لوازم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(۲) زبان کی حیثیت سے مجازات کی گنجائش بقول سیٹس کے اس بنا پر ہے کہ اس کی تعمیر دراصل مادی احساسات پر ہوئی ہے اس لئے جب بھی کسی ماوراء حس کیفیت کو بیان کرنا ہوگا اور محسوس و مرئی دلالتوں سے گذر کر معانی و مطالب کی سرحد میں قدم دھرنا ہوگا، اس وقت ہم مجبور ہوں گے کہ تشبیہ استعارہ سے کام لیں۔ مثلاً جب ہمیں کسی شخص کی شجاعت و بسالت کا تذکرہ کرنا ہوگا ہم کہیں گے کہ وہ شیر ہے کسی کے جود و عطا کا نقشہ کھینچنا ہوگا تو کہیں گے حاتم ہے اور اسی طرح کسی کی خطابت آرائی بیان کرنا ہوگی تو کہیں گے سحبان ہے اس لئے کہ شجاعت، جود و عطا اور خطابت ایسے معانی ہیں کہ ان کا کوئی مجرد مفہوم ذہن و قلب کی گرفت میں آنے والا نہیں جب تک ان محسوس علائق اور مناسبتوں کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ جن میں یہ معانی وابستہ ہیں۔

(۳) عربیت کے نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو کلام الٰہی کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ ایک ایسی زبان سے تعبیر ہے جس میں ایشیائی زبانوں کے ارتقاء کی پوری پوری جھلک پائی جاتی ہے یعنی اس میں روح و معنی کی اہمیتیں اس وجہ زیادہ ہیں کہ جس کی نظیر کم از کم مغربی زبانوں میں نہیں ملتی جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اس ذوقِ جمال اور اس خیال آرائی کی تمام تر خوبیوں کا انعکاس جلوہ ریز ہے جو ادبیات میں رمز و استعارہ کی تخلیق کا باعث ہوتی ہیں اور جس کے بارہ میں کہنا چاہیئے کہ صرف اسی خطۂ ارض کے ساتھ خاص ہے جو فکر و خیال کا اولین گہوارہ ہے۔

(۴) کلام الٰہی کے اس تجزیہ کا اہم پہلو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندوں سے مخاطب ہوگا تو اس کی سطح خطاب بہر حال یہی ہونی چاہیے جو عوام کے ذہن کے مطابق ہو جس کو وہ آسانی سے سمجھ سکیں جس سے وہ متاثر ہو سکیں اور جو ان میں عمل کے دواعی کو کامیابی کے ساتھ ابھار سکے دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ اول تو کلام الٰہی کے مضامین کو انہیں مطالب کی تشریح تک محدود رکھا جائے گا۔ جن کا تعلق ان کی روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ اخلاق و عادات سے ہے۔ اجتماعی فلاح و بہبود سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے ایسے تصوّر و عقیدہ سے ہے کہ جس سے ایمان و ایقان کی کیفیتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور تقرب و محبت کے رشتوں کو استواری

حاصل ہوتی ہے لیکن اگر اس وجہ سے کچھ اونچے اور لطیف معانی بیان کرنا ہی پڑیں کہ یہ کلام بہر حال عَلَّامُ الْغُیُوْبِ خدا کا کلام ہے تو یہ عین تقاضائے محبت ہے اور اس مناسبت سے ماورائے حس مطالب کی چہرہ کشائی کی جاتی ہے کہ مذہب کا مقصد صرف اخلاق و عادات کی اصلاح ہی نہیں بلکہ ذہن و فکر کو جلا بخشنا اور ترقی دینا بھی اس کے حدود میں شامل ہے۔ یا علم و عرفان کی سرحدوں سے روشناس کرانا اور دانش و حکمت کے نئے نئے دروازوں پر دستک دینا بھی اس کے فرائض کا ایک جز ہے تو یہ مذہب کے اونچے اور رفائق تر تقاضوں کے بالکل مطابق ہے۔

ایسی صورت میں عوام کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور زمان و مکان کی مجبوریوں کے پیش نظر ان مطالب کے اظہار کیلئے پیرایۂ بیان ایسا مجازی (FIGURATIVE) اختیار کیا جاتا ہے۔ جو آسانی سے سمجھ میں آسکے۔

زیادہ تفصیل کے لئے اس موضوع پر سپینوزا (SPINOZA) کے ان بیش قیمت افکار کا مطالعہ کرنا چاہیئے جس کا اظہار اس نے کتب مقدسہ کی تشریح کے سلسلہ میں کیا ہے۔

یوں اگر رمز و استعارہ کو فنی اصطلاح میں منحصر نہ سمجھ لیا جائے اور اس میں تھوڑی سی وسعت پیدا کر لی جائے تو قرآن سے بھی اس کے انداز استدلال سے متعلق ایسے شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں کہ جن سے یہ معلوم ہو سکے اسنے اکثر دقیق اور اونچے حقائق کو مثالوں کے رنگ میں بیان کیا ہے بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہنا چاہیئے کہ اس اسلوب اظہار کو اس نے اپنا مایہ الامتیاز وصف ٹھہرایا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ[1] — لوگو ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ

خدا آسمانوں کا اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل ایسی شفاف ہے کہ موتی کا سا چمکتا ہوا ستارہ ہے اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے یعنی زیتون کہ مشرق کی

---

[1] سورہ حج ۷۳

زَيْتُهَا يُضِيْءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط ۱

طرف ہے نہ غرب کی طرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تیل خواہ آگ نہ بھی چھوئے جلنے کو تیار ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۲

اور ان سے دنیا کی بے ثباتی کی مثال کے ذریعہ بیان کرو زندگی ایسی ہے جیسے پانی۔ جسے ہم نے آسماں سے برسایا تو اس کے ساتھ زمین کی روئیدگی مل گئی پھر وہ چورا چورا ہو گئی کہ ہوائیں اپنے دوش پر اڑاتے اٹھاتے پھرتی ہیں خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۳

اور ہم نے لوگوں کو سمجھانے کے لئے قرآن میں طرح طرح کی مثالیں بیان کی ہیں۔

کتب مقدسہ کی تشریح و تعبیر کے سلسلہ میں اگر اس اصول کو بطور ایک امر واقعہ کے مان لیا جائے تو بہت سی پیچیدگیاں آپ سے آپ دور ہو جاتی ہیں کہ انمیں اگرچہ زندگی کے موٹے موٹے حقائق صاف طریق سے بیان کئے گئے ہیں تاہم جہاں تک اعلیٰ تصورات یا کائنات کے بارہ میں علمی نکات کا تعلق ہے ان کے اظہار کیلئے قوموں کی ذہنی سطح کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ اور ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرنا زیادہ موثر، زیادہ فہم و فکر کی گرفت میں آنے والا اور زبان کے چٹخارے کو بڑھانے والا ہے جس میں کھلے کھلے حقائق کے بجائے رمز و استعارہ کی چاشنی سے کام لیا جائے اور ان کو ایسے قالب میں ڈھالا جائے کہ جس سے نگاہ و ذوق پہلے سے آشنا ہو۔

اس حقیقت کو ایک مرتبہ تسلیم کر لیجئے اور پھر دیکھئے کہ فکر و عقاید کی کتنی گرہیں کھلنا شروع ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا مسئلہ مثلاً کس درجہ سلجھاؤ اختیار کر لیتا ہے اس کے بعد یہ بات بھی آسانی سے سمجھ میں آسکے گی کہ عہد نامہ قدیم کا خدا کیوں غضبناک ہے کیوں اس کے نتھنوں سے دھواں نکلتا ہے اور کیوں اس کی صفات ایک خاص قوم کے مزاج کی ترجمانی کرتی ہیں۔

۱؎ نور ۳۵ ۲؎ کہف ۴۵ ۳؎ کہف ۵۴

اس حقیقت کو پالینے سے ہمارے ہاں جو صفات پر لاطائل جھگڑے ہوئے، جو بیکار بحثیں ہوئیں۔ اور اور فکر و نظر کے جو مختلف مدارس پیدا ہوئے۔ ان سب کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور یہ بات ابھر کر دیدۂ و نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے ہاتھ[1]، منہ[2]، آنکھ[3] اور استواء[4]، ایسی کیفیات و شئوون کا استعمال بطور مجاز کے ہوا ہے۔ بطور حقیقت و واقعہ کے نہیں۔ اور انہی لسانی اور تاریخی مجبوریوں کی بنا پہ ہوا ہے۔ جن کی تفصیل ہم کسی حد تک بیان کر چکے ہیں۔

یہ بات ہم صرف اپنی بات منوانے کے لئے نہیں کہتے بلکہ اس بنا پر کہتے ہیں کہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی صفات سے متعلق جو واضح حقائق بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ بے نظیر ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ — کوئی شے بھی اس سے مماثل نہیں!

جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ہستی کو وجود کے کسی معروف دائرے (CATEGORY) میں نہیں رکھا جاسکتا۔

اور یہ کہ اگرچہ وہ علم، قدرت اور ربوبیت ایسی صفات سے متصف ہے جن پر بظاہر انسانی صفات کا شبہ ہوتا ہے۔ تاہم اس کا علم، اس کی قدرت اور ربوبیت اسی درجہ، مختلف اسی درجہ، وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ چشم ادراک اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ[5] — آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر پاتیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ تنزیہہ صفات کا مسئلہ صرف فلسفہ و کلام ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ دینیات کا بھی ہے چنانچہ قرآن نے اثبات کے پہلو بہ پہلو صفات کو نکھارا بھی ہے اور تجسم و تشبیہہ کے ان تمام پہلوؤں کی نفی بھی کی ہے۔ جو کسی درجہ میں بھی شرک کے مترادف ہو سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے بارہ میں یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ علیم ہے، حکیم ہے اور قادر و رحیم ہے وہاں یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اس کے علم، حکمت اور رحم و بخشش کی نوعیت کیا ہے، یعنی اس کی یہ صفات عالیہ کہیں جسمانیت و مماثلت کے شوائب کی حامل تو نہیں۔

---

۱ يد الله فوق ايديهم (فتح ۱۰) ۲ كل شيء هالك الا وجهه (قصص ۸۸) ۳ واصنع الفلك باعيننا (هود ۲۷) ۴ الرحمن على العرش استوى (طه ۵) ۵ انعام ۱۰۳

تنزیہہ صفات کے سلسلہ میں یہ چیز جان لینے کی ہے کہ ایسے الفاظ کو مجازات پر محمول قرار دینا ہی صحیح تنزیہی تقاضوں کی تکمیل کے مترادف ہے جن کے مدلولات تشبیہہ و جسمانیت کے غماز ہیں اس لئے کہ دوسرا کوئی مفہوم فلسفیانہ وضاحت کا حامل ہی نہیں۔ مثلاً ید و وجہہ اور استواء وغیرہ الفاظ کے اطلاقات کے بارہ میں علامہ ابن تیمیہ کی تاویل کو اگر قبول کر لیا جائے تو اس سے کوئی متعین اور صاف مفہوم ذہن نشین نہیں ہو پاتا۔ ہمارے نزدیک امام احمد بن حنبلؒ کے اس قول میں بہرحال جان ہے کہ :-

الاستواء غیر مجہول والتکیف غیر معقول والایمان به واجب والسوال عنه بدعة[1]

کیونکہ ان کا موقف ایک ایسے راسخ العقیدہ مومن کا موقف ہے جو الفاظ کے سادہ اطلاقات پر بشرط تنزیہہ مطمئن ہے اور نہیں چاہتا کہ تنزیہہ کی مزید وضاحت بیان کی جائے لیکن جو شخص تاویل و تعبیر کی پر خطر وادیوں میں گام فرسا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ نصوص کے ساتھ ساتھ فکر و دانش کے تقاضوں سے بھی عہدہ برا ہو اسے چاہیئے کہ ایسی بات کہے جو فلسفیانہ صراحت کی حامل ہو۔

ان کی یہ تاویل کہ اللہ کا ہاتھ تو ہے مگر ہاتھ کی طرح نہیں اور چہرہ ہے مگر چہرہ کے انداز کا نہیں۔ ایسی تاویل ہے جس کا کوئی واضح اور نکھرا ہوا مفہوم ذہن و فکر کی گرفت میں نہیں آپاتا۔ کیونکہ جب کوئی شخص اس کے لئے ہاتھ، چہرہ اور آنکھوں کا لفظ استعمال کرتا ہے تو منطقی طور پر اس کے دو معنی ہوتے ہیں۔

(۱) یہ کہ یہ شخص اس کی ذات گرامی کے لئے ایک طرح کی جسمانیت کو تسلیم کرتا ہے۔

(۲) یہی نہیں۔ وہ اس جسمانیت کی ایک خاص شکل اور ہیئت بھی مانتا ہے۔ جو ہاتھ۔ چہرہ اور آنکھ سے تعبیر ہے۔

لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ اس کا ہاتھ عام ہاتھ کی طرح نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نفی کا ہدف کون چیز ہے اور اس کا اطلاق معنی کے کس حصہ پر ہوتا ہے؟ اس حصہ پر کہ اس کے لئے سرے سے جسمانیت ثابت ہی نہیں یا اس حصہ پر کہ جسمانیت تو ثابت ہے مگر اس کی کوئی متعین شکل و

---

[1] نقض المنطق ص۳ طبع اول مطبع السنة المحمدیہ مصر۔

صورت نہیں، جس کو ہاتھ، چہرہ اور آنکھ ایسے الفاظ سے تعبیر کرسکیں۔

اگر یہ پہلا موقف تسلیم کرلیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہاتھ وغیرہ کا استعمال محض بطور مجاز کے ہوا ہے حقیقت کے انداز میں نہیں۔

اور اگر دوسرا موقف صحیح ہے کہ نفی سے مراد صرف ہیئت و شکل کی نفی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسمانیت تو ثابت ہے، عضویت ثابت نہیں یعنی نفی سے مراد صرف ایک خاص تعین کی نفی ہے نفس جسمانیت کی نہیں۔

ظاہر ہے علامہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اس تجزیہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ اگر تنزیہ کا کوئی مثبت مفہوم ہے تو وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے باب میں اس طرح کے الفاظ کو ناکافی الدلالہ سمجھا جائے اور اس حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف کرلیا جائے کہ فکر و اندیشہ کے اس ارتقاء کے باوجود الفاظ و حروف کا کوئی ایسا جامہ اب تک تیار نہیں ہو پایا۔ جو اس کی قامتِ زیبا پر راس آسکے اور اس کے حسن و خوبی کے جملہ پہلوؤں کو مشتاقانِ دید کے سامنے ابھار سکے۔

(باقی آئندہ)

سرگزشتِ غزالی

مترجمہ: محمد حنیف ندوی

امام غزالی کی "المنقذ" کا اردو ترجمہ جس میں انہوں نے اپنے فکری و نظری انقلاب کی دلچسپ داستان بیان کی ہے اور بتلایا ہے کہ کس طرح انہوں نے جبہ و عبا اور مسند و دستار کی زندگی چھوڑ کر گلیم و فقر کی روش اختیار کی اور تصوف کو اپنا نصب العین قرار دیا۔

قیمت ــــــــ ۳ روپے

ملنے کا پتہ:۔ سیکرٹری ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور